''قصبہ کہانی''میں ہم عصر سماج

شاہد نواز*

Abstract:

In this artcile with the method of close reading and historicity, it is argued that the novel of renowned Urdu literary historian Tabassum Kashmiri, Qasbah Kahani is a fine example of contemporary history. This novel, instead of describing directly the contemporary history, used symbolic and indirect stylistic methods to present and interpret it.

ڈاکٹر تبسم کاشمیری اردو ادب کی روایت میں نقاد اور ادبی مورخ کے طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ اگر چہ ان کی ایک تخلیقی جہت شاعر کی بھی ہے۔ مگر ان کی حقیقی شہرت ''اردو ادب کی تاریخ'' کے منظر عام پر آنے کے بعد ہوئی۔ غلام ہمدانی مصحفی پر اپنا مقالہ تحریر کرنے والے تبسم کاشمیری کا تنقیدی و تحقیقی شعور اوائل عمری سے ہی نہایت پختہ ہے۔ اس پختگی کا ثبوت ان کی تصنیف لا = راشد ہے۔ یہ کتاب ان کی ابتدائی تنقیدی کاوشوں میں سے ایک ہے۔ راشد پر اب تک جتنی تنقیدی تحریریں منظر عام پر آئی ہیں۔ ان میں لا = راشد انتہائی نمایاں اور وقیع ہے۔

''اردو ادب کی تاریخ'' نے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کو اردو کے اول درجے کے ناقدین و محققین میں شامل کر دیا ہے۔ آج اردو ادب کا قاری اور ناقد انہیں ان کے کام کی وجہ سے انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تاریخ نویسی انتہائی مشکل کام ہے۔ چہ جائیکہ ادبی تاریخ نویسی۔ ادبی مورخ ایک ایسا کردار ہے' جو بیک وقت ادب اور سماج کی تاریخ اور تعلق کو دریافت کرتا ہے۔ حقائق اور اعداد و شمار کے گورکھ دھندے میں الجھنے کی بجائے وہ ادبی تاریخ اور ادوار کو ایک تسلسل اور بہاؤ کی صورت اس طرح پیش کرتا ہے کہ پس منظر اور حقائق آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔

* شعبہ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

اردو میں ادبی تاریخ نویسی کی ایسی کاوشیں نایاب ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی سے قبل اردو تاریخ نویسی صرف حقائق اور اعداد شمار کا گورکھ دھندہ تھی۔مگر گذشتہ تین دہائیوں میں یہ صورتحال تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔

> ''اردو ادب کے مورخوں نے تو اپنے ذہن کو کبھی اس میں الجھایا ہی نہیں کہ مورخ کی حیثیت سے ان پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔اس لیے انہوں نے یا تو قدیم تذکرہ نویسوں کی پیروی کی یا زیادہ سے زیادہ ادوار کا ایک میکانکی تصور قائم کر کے تاریخ کو ادوار میں بانٹ دیا۔لیکن اس پیچیدہ عمل اور ردعمل کو نظر انداز کر دیا ادب جس کے تحت ایک پہلو یا مظہر کی حیثیت رکھتا ہے''۔(۱)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تخلیقی جہت کا ایک منظر ان کی ناول نگاری کی صورت سامنے آتا ہے۔بعض قارئین کے نزدیک یہ بات باعث حیرت ہوگی کہ تاریخ اور تنقید کے بحر کا شناور افسانوی ادب میں کس طرح پہنچ گیا۔مگر اردو ادب کی تاریخ کو غور سے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی تحریر کا اسلوب اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ وہ افسانوی ادب کے اسیر ہیں۔''اردو ادب کی تاریخ'' کو جس اسلوب اور تکنیک کے ساتھ پیش کیا گیا ہے' میرے نزدیک وہ ایک خوبصورت اور پختہ ناول ہے۔ مجھے یہ کتاب پڑھتے ہوئے ہمیشہ ایک ناول کا گماں ہوا ہے۔ممکن ہے کہ آئندہ ادوار میں ایسی تکنیک مہیا ہو جائے۔جس کی بدولت ادبی تواریخ کو بھی ناول کی کوئی قسم قرار دیا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا ہوا تو اردو میں ایسے ناول کی اولین کاوش ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اردو ادب کی تاریخ'' ہوگی ناول کی یہ قسم دریافت نہ بھی ہو تو ڈاکٹر تبسم کاشمیری سے اردو کے کامیاب ناول نگار ہونے کا اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا۔

''قصبہ کہانی'' لکھ کر ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس معرکے کو سر انجام دے چکے ہیں۔اس ناول کو پڑھنے کے بعد مجھے ایک حیرت نے آن لیا' کہ مصنف اتنے عمدہ ناول کے بعد اس حوالے سے خاموش کیوں ہے۔شاید بڑے تحقیقی وتنقیدی منصوبوں نے ان کی اس صلاحیت کو عارضی طور پر معطل کر دیا ہو۔

قصبہ کہانی اردو کے ان کامیاب ناولوں میں شامل ہے۔جنہیں اپنے عہد' ہم عصر اور سماج کا نقیب کہا جا سکتا ہے۔ مذکورہ ناول ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا اور اردو ناول کی روایت میں عمدہ اضافہ کر گیا۔دلچسپ امر یہ ہے کہ اردو ناول کی تنقید اور نقاد اس تخلیق کے بارے میں عمومی طور پر خاموش ہیں۔اس خاموشی کو لاعلمی' بے اعتنائی تعصب یا پھر روایتی تنقیدی چالوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

قصبہ کہانی اسم بامسمّٰی ہے۔ایک نقاد' محقق اور شاعر کے ہاتھوں تخلیق ہونے والی یہ قصبہ کہانی' علامتی طور پر پاکستان کہانی کا ایک منظر ہے۔نہایت پر اثر انداز میں لکھے جانے والے اس ناول کی سب سے اہم بات ہم عصر سماج اور عہد کا بیان ہے۔مرکزی کہانی دراصل کئی ذیلی کہانیوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ یہ کہانی دراصل بیسویں

صدی کی آٹھویں اور نویں دہائی کے پاکستان کے سماج' عہد اور عصر کی داستان ہے۔

ادب اور سماج کا تعلق بہت گہرا ہے۔ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے بحث میں الجھے بغیر یہ جان لینا کافی ہے' کہ ہر دو صورتوں میں ادب سماج سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔کسی فن پارے میں حال کا سماج نہیں ہو گا تو ماضی کا ہوگا اور اگر یہ دونوں صورتیں نہیں ہوں گی تو تخلیق کار اپنے تخیل اور زور بیان کے بل بوتے پر مستقبل کے سماج کو دکھائے گا۔مگر حقیقت یہی ہے کہ تخلیق کسی نہ کسی صورت سماج سے جڑی ہوتی ہے۔ایسے سماج جن میں ادب تخلیق نہیں ہوتا یا پھر وہ ادب جو اپنے سماج سے جڑا ہوا نظر نہیں آتا ایسا سماج اور ادب تہذیب کی معراج پر نظر نہیں آتا۔ ایسا سماج تو باقاعدہ طور پر سماج کہلانے کا مستحق بھی نہیں ہوتا۔

> ''ادب کسی بھی سماج کی بہت بڑی تہذیبی قدر ہوتی ہے۔ ہمارے لیے کسی ایسی تہذیب کا تصور کرنا محال ہے جو ادب سے تہی ہو۔ایسے معاشرے' گروہ یا قبیلے ہو سکتے ہیں' جن کا ادب نہ ہو لیکن ایسے معاشرے اس وقت تک تہذیب یافتہ نہیں کہلا سکتے' جب تک وہ ادب تخلیق نہ کریں۔اور بعض اوقات تو تہذیبوں کے قد و قامت کا اندازہ ان کے تخلیق کردہ ادب سے لگایا جاتا ہے۔خاص طور پر معدوم تہذیبیں اپنے ادب کی وجہ سے ہی زندہ رہتی ہیں''(۲)

اردو ناولوں میں اپنے سماج' عہد اور ہم عصر تاریخ کو پیش کرنے کا رجحان نہایت توانا ہے۔اردو ناول کے آغاز سے لے کر آج تک جتنا ناول تحریر ہوا ہے' اس کا بیشتر حصہ ہم عصر تاریخ اور سماج کا آئینہ دار ہے۔انیسویں صدی میں مسلمانوں کی جنگ ۵۷ء کی ناکامی کے بعد زوال آمادہ داستان ہو یا بیسویں صدی کے آغاز میں کروٹ بدلتا ہندوستانی سماج' سوراج کے لیے ابھرنے والی تحریکیں ہوں یا پھر تحریک پاکستان' قیام پاکستان اور ہجرت و فسادات کے مناظر ہوں پاکستانی حکمرانوں اور مقتدر طبقات کی کارستانیاں ہوں' سقوط ڈھاکا ہو یا اس کا پس منظر' بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں پاکستان کی سیاسی' سماجی صورتحال یا اکیسویں صدی کا بدلتا عالمی منظر نامہ' غرض یہ کہ اردو ناول نے ہم عصر تاریخ کے ہر عہد کو نہایت عمدگی سے محفوظ کیا ہے۔

> ''گذشتہ ایک سو چالیس سال میں انسانی تاریخ نے زبردست کروٹیں بدلی ہیں۔ پوری دنیا ہی میں انسانی زندگی میں ناقابل یقین اتھل پتھل ہوئی ہے۔جس کا اثر اردو فکشن بالخصوص ناول پر بھی پڑا۔ چوں کہ ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔اس لیے بدلتے ہوئے حالات میں سماجی' معاشرتی' تہذیبی' ثقافتی' اور معاشی زندگی نئے رنگ و ڈھنگ سے سامنے آتی ہے۔ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں تغیر کے تحت اس میں بدلاؤ ہی ناول کے قصے اور دیگر عناصر میں بدلاؤ کا سبب بنتا ہے... غرض ناول میں

نئے سماج کی کروٹوں کا انجذاب پڑھنے والوں کو نئے اور مختلف ذائقے سے روشناس کراتا ہے''۔(۳)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا ''قصبہ کہانی'' اسی روایت کا ایک جزو ہے۔ یہ ناول پاکستان میں آٹھویں اور نویں دہائی کی جزوی تاریخ ہے۔ ناول کا کینوس قصباتی زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔ ناول کا آغاز نظام باربر کی دکان کے ایک منظر سے ہوتا ہے۔

''یہ دسمبر کا مہینہ اور دوپہر کا وقت ہے۔ پت جھڑ کے باعث نظام باربر کی دکان میں پتوں کا ڈھیر داخل ہو گیا ہے۔ دکان کے ایک کونے میں چوہوں کا ایک پنجرہ پڑا ہے۔ جس میں اس نے اپنے دوپہر کے پراٹھے کا ایک لذیز لقمہ لگا رکھا ہے۔ دکان میں کئی دن سے چوہوں نے حملہ کر رکھا تھا اور اکثر رات کو اس کے تولیے اور چادریں کتر جاتے تھے''(۴)

نظام باربر کی دکان قصبے میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ قصبے کا ہر صاحب حیثیت اور باشعور کردار وہاں اپنی اپنی غرض سے آتے ہیں۔ یوں یہ دکان خبروں' تجزیوں اور افواہوں کا مرکز ہے۔ ناول کی کہانی میں یہ دکان مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ ناول کی ابتدا میں قصبہ جیتا جاگتا متحرک اور چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ ناول میں جن کہانیوں کو ایک لڑی میں مرکزی کہانی کے اردگرد پرویا گیا ہے' ان میں مسجد و خانقاہ میں کشمکش' قصبے کے مالدار اور بدمعاشوں کی کہانی' پولیس اور سرکاری ملازموں کے کارنامے' طبیبوں اور تھیٹرز کے حالات' خانگی امور اور باپ کی رکھیل کے ساتھ بیٹے کے بھاگنے کی کہانی' سرکاری مشینری کے جبر اور اس کے نتیجے میں قصبے کے ایک کردار کے انتقام کی کہانیاں نمایاں ہیں۔

قصبہ کہانی میں قصباتی زندگی کی عمدہ جزئیات نگاری کی گئی ہے۔ ناول نگار کا مشاہدہ گہرا ہے۔ جس کی بدولت وہ جزئیات نگاری میں کامیاب رہتا ہے۔ قصبے میں قدامت سے جدیدیت کے سفر کا ایک منظر اپنی جزئیات کے ساتھ ملاحظہ ہو:

''ماسٹر جی ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ قصبے کے سب سے بوڑھے لوگ۔ ہاں بھائی حکم دین یہ ٹھیک ہے۔ باقی جب تک اس کی رضا ہے۔ قصبہ اب کتنا بدل گیا ہے۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں قصبہ جوان ہو گیا ہے۔ دیکھ لو بجلی آ گئی ہے۔ ہسپتال بن گئے ہیں۔ ٹیلی فون لگ گئے ہیں' ٹیلی ویژن چل پڑے ہیں۔ لفافوں میں بند' دودھ' دہی اور خوراک بکنے لگی ہے۔ بہت کچھ ہو گیا ہے۔ پھلوں کے رس بھی ڈبوں میں مل رہے ہیں۔ پرانا زمانہ یاد ہے ماسٹر جی۔ جب قصبے میں تیل کا چراغ جلتا تھا۔ شام کے بعد

لوگ گھروں میں بند ہو جاتے تھے۔شہر جانے کے لیے پانچ میل پگڈنڈی پر پینڈا کرنا پڑتا تھا۔مگر اس وقت قصبہ بھی تو بہت چھوٹا تھا۔تھوڑی سی آبادی تھی''(۵)

ناول عمومی طور پر بیانیہ اسلوب کا حامل ہے مگر بعض حصوں میں علامتی پیرایہ پہن لیتا ہے۔ناول کا مرکزی کردار بے نام ہے۔جو دراصل پولیس کے تشدد اور قصبہ والوں کی بے انصافی سے قصبہ بدر ہو جاتا ہے۔بعد ازاں یہی کردار قصبے کے نامور لوگوں کے گھروں میں چوریاں کرتا ہے اور ان کو خفیہ خطوط رقم کرتا ہے۔ان خطوط میں وہ قصبے کے دگرگوں حالات کی وجوہات بیان کرتا ہے۔یہ علامتی کردار دراصل بدامنی اور دگرگوں حالات کی خرابی کی بڑی وجہ قصبے میں ناانصافی اور مزاحمت نہ ہونے کو قرار دیتا ہے۔یوں قصبہ میں بدامنی کی یہ وجہ علامتی طور پر پاکستانی سماج میں بدامنی پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے۔اسی پس منظر سے ناول نگار ناول کے وسط سے پروفیسر ساجد کا ایک ایسا کردار سامنے لاتا ہے' جو مزاحمت کی علامت ہے۔پروفیسر ساجد صراط مستقیم پر سوچتا اور چلتا ہے۔وہ مختلف آدرشوں کا اسیر ہے۔مگر سماج اور اس کی مصلحتیں اس کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

ناول کا یہ حصہ دراصل پاکستان میں تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد پر ہونے والے جبر اور ناانصافیوں کی داستان لیے ہوئے ہے۔پاکستان میں طویل عرصہ مختلف مارشل لاء رہے۔مارشل لاء سے جو عرصہ بچتا ہے' وہ بھی شخصی آزادی اور آزادی اظہار کے لیے بہت زیادہ سازگار نہیں رہا۔ایسے میں پاکستانی سماج میں آزادی اظہار کرنے والے مزاحمتی کرداروں کو ریاستی تشدد اور جبر کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔پروفیسر ساجد ان کرداروں میں سے ایک ہے' جنہیں ناکردہ جرائم کی پاداش میں کبھی جسمانی تو کبھی ذہنی تشدد سے گزرنا پڑا۔پروفیسر ساجد کا جب مخصوص نظریات کی بنیاد پر ''لاحاصل پور'' تبادلہ کیا جاتا ہے' تو وہ بہت بڑی ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتا ہے۔کیونکہ یہ ''لاحاصل پور'' کیا ہے اور کہاں ہے۔اس تک رسائی بذات خود بہت بڑا ذہنی تشدد ہے۔''لاحاصل پور'' بذاتہ ایک بہت بڑی علامت ہے۔مزاحمت کرنے والوں اور سماج کے لیے مثبت آدرش رکھنے والوں کو ہمارے ہاں عمومی طور پر ایسے ہی سفر پر روانہ کیا جاتا ہے۔یہ ہماری تاریخ ہے۔ہمارا وطیرہ ہے اور یہی وطیرہ ہماری تباہی اور ناکامی کی اصل وجہ ہے۔''لاحاصل پور'' سے متعلق رہنما کی زبانی پروفیسر ساجد کو جو بتایا جا رہا ہے۔ذرا ملاحظہ کریں۔

''گھبرا گئے ابھی سے۔ابھی تو لمبی مسافت باقی ہے۔گاڑی کی پٹڑی جب ختم ہو جائے تو بس میں سوار ہو جانا۔اور تیسرے پہر پل پر اتر جانا۔سرخ پل سے آگے کالا جنگل ہے۔کالے جنگل کے بعد گرم جھیل آئے گی۔جسے تم تیر کے پار کرو گے۔جھیل کے ادھر خاموش بستی ہے۔اس بستی میں کئی سو نفوس آباد ہیں۔وہ سب کے سب ہمیشہ خاموش رہتے ہیں کہ ان کو چپ رہنے کی سزا دی گئی ہے''۔(۶)

پروفیسر ساجد اس المناک سفر پر روانہ ہوتا ہے۔مگر مزاحمت کی علامت پروفیسر سفر کی بھول بھلیوں میں ہی گم رہتا ہے۔صحراؤں اور خون کے دریا عبور کر کے بھی یہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ یہ سفر پاکستان کے ہر باشعور اور مثبت سوچ رکھنے والے فرد کو لاحق ہے۔

قصبہ کہانی دراصل بیانیہ سے علامتی اسلوب اور کہانی کا سفر ہے۔ناول نگار ملک میں پائی جانے والی بے چینی' سیاسی نظام کے عدم استحکام اور ریاست کے نظام پر قبضہ کرنیوالے اداروں کو مختلف علامتوں اور علامتی اسلوب کے ذریعے تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ناول میں طوفان کی آمد' خون ریزی' قصبے کے درودیوار کے لرزنے اور میاں بیوی کی طرف سے اپنے گھر کو بچانے کے لیے مزاحمتی کوششیں دراصل ہماری تاریخ کے صفحات ہیں۔مسٹر اور مسز جاوید اپنے گھر کو بچانے کے لیے اس طوفان کے آگے بند باندھنے کی کوشس کرتے ہیں۔مگر ان کی ہر کوشس ناکام ہو جاتی ہے۔آخر کار وہ باری باری اپنے جسموں پر اس طوفان کی شدت کو روک کر گھر کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔مگر اس طوفان میں جو پرندے نمودار ہوتے ہیں وہ بہت بدہیئت اور خوفناک ہیں۔وہ اس طوفان کی شدت کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔ان پرندوں کا نقشہ دراصل اپنے اندر بہت سے اشارے رکھتا ہے :

> ''ان مکروہ پرندوں کی نوکیلی بدہیئت آوازوں سے قصبے کے دروازے ٹوٹنے لگے ہیں۔نہایت بدہیئت پرندے سرخ رنگ کی بارش میں زمین پر قبضہ کر چکے ہیں۔ان پرندوں کی ٹانگیں ساڑھے تین میٹر لمبی ہیں۔فٹ بھر لمبے ان کے پنجے ہیں۔جن پر بڑے بڑے کالے بوٹ چڑھے ہوئے ہیں۔ڈیڑھ فٹ قطر کی گول آنکھیں ہیں۔ جن پر عینکیں لگی ہیں۔ان کے بڑے بڑے سروں پر کالے پروں کی بدزیب ٹوپیاں جڑی ہوئی ہیں۔ان کی چونچیں ایک فٹ سے زیادہ لمبی اور بہت تیکھی ہیں۔ان چونچوں سے وہ دیواروں میں سوراخ کر رہے ہیں''(۷)

تبسم کاشمیری نے نئی علامتوں کو فکشن میں داخل کیا ہے۔یہ علامتی اسلوب اور ڈھانچہ دراصل ان کے اختراعی ذہن کی پیداوار ہے۔ان علامتوں میں لمبے پنجے اور ان پر سیاہ بوٹ' بدزیب ٹوپیاں اور لمبی چونچیں دراصل خاص کرداروں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔یہ کردار پاکستانی تاریخ میں جبر اور آمریت کے نمائندہ ہیں اور انہوں نے اپنے اعمال سے پاکستان کی عمارت میں سوراخ کر کے اس کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

دوسری طرف جب پروفیسر ساجد لاحاصل پور پہنچتا ہے تو وہاں بھی اس کو سکھ کا سانس نہیں لینے دیا جاتا۔ دراصل پروفیسر ساجد جیسے مزاحمتی اور روشن ضمیر کردار ریاست کے نام نہاد وفاداروں اور ٹھیکے دار حکمرانوں کو خوش نہیں آتے۔ان کا بس نہیں چلتا کہ ایسے مزاحمتی کرداروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لے چپ کروا دیں۔انتظامیہ ایسے کرداروں کو

ایسی اذیت ناک سزا دیتی ہے کہ وہ باقی کرداروں کے لیے مثال عبرت بن سکیں۔ لاحاصل پور میں پروفیسر ساجد مقامی لوگوں خصوصاً مزدوروں کو باشعور کرنے' مزدور یونین کے لیے کام کرنے اور ان مزدوروں کو اپنے حقوق کے لیے بیدار کرنے جیسے الزامات کی زد میں آتا ہے۔ یوں وہ خفیہ اداروں کے ایک تحقیقاتی مرکز میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔تحقیقاتی مرکز میں پروفیسر ساجد کو ان تمام اذیت ناک مراحل سے گزرنا پڑتا ہے' جو پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے اپنے مخالفیں کے لیے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ پروفیسر ساجد ان عقوبت خانوں میں تنہا نہیں ہے۔ بلکہ وہاں پر اس کے بہت سے ساتھی ہیں۔جن کو بولنے کی سزا دی جا رہی ہے۔ یہ کردار کنوؤں میں الٹے لٹکائے گئے ہیں اور کنوئیں زہرناک دود سے بھرے ہوئے ہیں۔سزا کا یہ عرصہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا ہے۔اور حکمرانوں کا ایک ہی مطالبہ ہے کہ بولنا چھوڑ دو۔

> ''ساجد سیل کے سوراخ سے دیکھتا ہے کہ کنوئیں کے باہر موٹی موٹی مونچھوں والا نگہبان کھڑا ہے۔اس کے ہاتھ میں بید ہے اور سر پر ٹوپی۔نگہبان کنوئیں کے اندر اندھا دھند بید گھماتا ہے۔ سالو چیختے رہو۔ اب بولو گے۔ دھائیں۔ دھائیں۔ دھائیں۔ اب بولو گے۔ دھائیں۔ دھائیں۔ دھائیں۔کنوئیں کے قیدی سسکتے ہوئے سانس بند کر لیتے ہیں''**(۸)**

یہ جبر اور ظلم دراصل پاکستان میں ضیائی دور کی یاد دلاتا ہے۔ جب مزاحمتی آوازوں کو دبانا اور کچلنا انتظامیہ کی اولین ترجیح ہوتی تھی۔ روشن ضمیر لوگوں کو کوڑے مارنا' ٹکٹکی پر چڑھانا' عقوبت خانوں میں مختلف سزائیں دینا' ان حکمرانوں کا دل پسند مشغلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں اس دور میں تشدد کی ایسی رسم چلی کہ پھر معاشرہ تشدد کی لپیٹ میں آتا چلا گیا۔

قصبہ کہانی کا انجام پورے قصبے میں انتشار اور ظاہری و باطنی تکالیف کے اژدھام پر ہوتا ہے۔ قصبے کے بڑے بوڑھے جو اس قصبے کی تمام روایات اور ماضی کے امین ہیں۔ان کو یوں لگتا ہے کہ قصبہ ایک دم کھائی میں گرنے لگا ہے۔ وہ بچانا چاہتے مگر ناکام ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔قصبہ کہانی کا انجام ضیائی مارشل لاء کے اختتام کے ساتھ جڑا دکھائی دیتا ہے۔ وہ گہری کھائی کہ جس میں قصبہ گرتا دکھائی دیتا ہے۔تشدد' عدم برداشت اور نام نہاد مذہبی نظام کی وہ گہری کھائی ہے۔جس کو ضیا دور میں کھودا گیا۔ پاکستان گذشتہ بیس پچیس سالوں سے اس گہری کھائی میں گر رہا ہے۔ تباہی و بربادی اور خون ریزی اس کا مقدر بن چکا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ قصبہ کہانی (پاکستان) کے باشندے ایک طویل عرصے تک اس گہری کھائی میں اذیتوں کا شکار رہیں گے۔

ناول نگار نے ''قصبہ کہانی'' میں نہایت عمدگی سے اپنے عہد کے آشوب کو بیان کیا ہے۔ قصبہ کہانی

دراصل پاکستان کہانی ہے۔ناول نگار نے اس کہانی کے مختلف حصوں میں نہایت عمدگی سے تاریخ پاکستان کے صفحات کو فکشن کے پیرائے میں محفوظ کیا ہے۔یوں قصبہ کہانی اردو ناول کی روایت میں منفرد اسلوب بیان اور کہانی کی بنا پر نہایت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احتشام حسین''ادبی تاریخ''،مشمولہ ادبی تاریخ نویسی' متربین' ڈاکٹر سید عامر سہیل'نسیم عباس احمر'لاہور' پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی۔۲۰۱۰ء۔۱۳

۲۔ ایم۔خالد فیاض'ادبی مورخ کے لیے تہذیبی اور سماجی شعور کی اہمیت' مشمولہ ادبی تاریخ نویسی' متربین، ڈاکٹر عامر سہیل' نسیم عباس احمر'لاہور' پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی۔۲۰۱۰ء۔۳۳۲

۳۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان'اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار'لاہور فکشن ہاؤس۔۲۰۱۲ء۔ص ۵۷

۴۔ تبسم کاشمیری'قصبہ کہانی'لاہور' سنگ میل پبلی کیشنز۔۱۹۹۳ء۔ص ۳

۵۔ ایضاً۔ص ۱۳

۶۔ ایضاً۔ص ۱۷۰

۷۔ ایضاً۔ص ۲۹۹

۸۔ ایضاً۔ص ۲۳۲